اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام

☆

ڈاکٹر اسرار احمد

☆

قرآن حکیم کی اساس پر تجدید ایمان اور احیاءِ علم کی نئی تحریک

فرمانِ نبویؐ

((مَنْ جَاءَ ہُ الْمَوْ تُ وَ ھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لِیُحْیِیَ بِہِ الْاِسْلَامَ
فَبَیْنَہٗ وَ بَیْنَ النَّبِیِّیْنَ دَرَجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ))

(رواہ الدارمی عن الحسن مرسلاً ورواہ ایضًا الطبرانی فی الاوسط عن ابن عباسٍ
و کذا الخطیب عنہ مرفوعًا) (لمعات التنقیح فی شرح مشکوۃ المصابیح)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور۔
www.tanzeem.org

عنوانات

☆ فکرِ مغرب کا ہمہ گیر اسیلاء
☆ بنیادی نقطۂ نظر
☆ عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی وفکری یورش
☆ مدافعت کی اوّلین کوششیں اور ان کا ماحصل
☆ علومِ قرآنی کا ارتقاء
☆ اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں
☆ تعبیر کی کوتاہی
☆ ’احیائے اسلام‘ کی شرط لازم: ’تجدید ایمان‘
☆ کرنے کا اصل کام
☆ عملی اقدامات

تقدیم

میری یہ تحریر جو صفحاتِ آئندہ میں پیش کی جا رہی ہے، اولاً ماہنامہ 'میثاق' لاہور بابت جون ۶۷ء کے ادارتی صفحات میں شائع ہوتی تھی۔ بعدازاں مئی ۶۸ء میں اسے دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور، نے ایک کتابچے کی صورت میں ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ دوسری بار یہ کتابچہ دسمبر ۷۲ء میں دو ہزار کی تعداد میں طبع ہوا۔ تیسری بار جون ۷۳ء میں چار ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ چوتھی مرتبہ جون ۸۰ء میں دو ہزار طبع ہوا۔ اور اب پانچویں بار اپریل ۸۲ء میں ساڑھے پانچ ہزار کی تعداد میں طبع ہو رہا ہے۔

اس میں، میں نے اپنے فہم کی حد تک بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت ہم بحیثیت مسلمان کس مقام پر ہیں اور یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور امتِ مسلمہ کی تعمیرِ نو کے لئے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے، فی الوقت کیا ہو رہا ہے اور کیا کرنا باقی ہے۔ ساتھ ہی اپنے تجزیئے (Analysis) کی بنیاد پر میں نے ایک اساسی لائحہ عمل بھی پیش کیا تھا اور فوری اور اولین اقدام کے طور پر ایک 'قرآن اکیڈمی' کے قیام کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

اس لائحہ عمل کو پیش کرنے کے فوراً بعد ہی 'بحمد للہ' میں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ پانچ سال کی محنت کے دوسرے بہت سے ثمرات کے ساتھ ساتھ ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ اس نہج پر باقاعدہ اجتماعی جدوجہد اور خصوصاً 'قرآن اکیڈمی' کے مجوزہ خاکے کو عملی صورت دینے کے لئے ۷۲ء میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کا قیام عمل میں آ گیا جس کی قرارداد تاسیس (Memorandum) اور اغراض و مقاصد میں ان تجاویز کو بالکلیہ سمو لیا گیا اور اسے گویا اس کے اساسی منشور (Manifesto) کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

پندرہ سال کی مدت میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں تاہم کچھ اس بناء پر کہ میرے نزدیک حالات میں بنیادی تغیر کوئی واقع نہیں ہوا اور کچھ اس وجہ سے کہ اب اس تحریر کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے، اسے بغیر کسی ترمیم کے شائع کیا جا رہا ہے بجز اس کے کہ آخری دو صفحات کی عبارت میں کچھ اختصار کر کے مجوزہ قرآن اکیڈمی کے ضمن میں پیش رفت کا جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔

اپریل ۸۲ء

خاکسار: **اسرار احمد**

صدر مؤسس انجمن خدام القرآن، لاہور

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات یعنی انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً 200 سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد جو مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب و تمدن کا سکہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرز فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں' ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض اُن قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقت نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف صف آراء ہیں تو معلوم ہوتا کہ وہ بھی مغرب کے اثرات بالکلیہ محفوظ نہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بنیادی نقطۂ نظر

تہذیب جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتب فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا۔ لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل

پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیال' اور ''ماورائی'' تصورات کے بجائے 'ٹھوس' حقائق وواقعات کو غور وفکر اور سوچ و بچار کا اصل مرکز ومحور ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات' روح کے بجائے مادہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کے بجائے حیات دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا' روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار' لیکن اس عدم اقرار وانکار کا نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ ''یہ تصورات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور وفکر اور تحقیق وتجسس کا مرکز ومحور کائنات' مادہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہرحال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرہ تحقیق وجستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ـــــ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت ووسعت کے اعتبار سے مہر درخشاں کی حیثیت ووقعت ایک ''ذرۂ فانی'' سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک ''ذرہ فانی'' کی حقیقت وماہیت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود ''مہر درخشاں'' کی عظمت وسطوت کا حامل نظر آتا ہے۔[(۱)] اسی طرح حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات' روح کے مقابلے میں مادہ اور حیات اخروی ے مقابلے میں حیات دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب' کائنات اور مادہ تحقیق وجستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ وخوابیدہ مظاہر قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکاچوند رہ گئیں

(۱) مہر درخشاں ذرۂ فانی...... ذرۂ فانی مہر درخشاں (کوثر)
بقول اقبال ع ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں''

اور علم وفن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ـــــ قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت' فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات واختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابل شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئی کہ اصل قابل التفات شے مادہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد وقوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات وصفات!

عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی وفکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرہ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے۔ لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہل اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالم اسلام یورپ کے زیر نگیں ہو گیا۔

عالم اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دوگونہ تھا۔ یعنی عسکری وسیاسی بھی اور ذہنی وفکری بھی' لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالم اسلام میں جو ردعمل اس کے خلاف پیدا ہوا اس میں بھی اولاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے' ملتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہِ راست تسلط اور قبضے اور کہیں انتداب وتحفظ وحمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں تقسیم کر کے اس کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے' بارہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد' اپنی ''عمر رفتہ'' اور عظمت وسطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنا اور ''گردش ایام'' کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سید جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیت کا روپ دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن

حقائق نے ہر بار جذبات وخواہشات کا منہ چڑایا اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار ونظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ کی —— یعنی ذہنی وفکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادی ترقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا، نتیجتاً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار ونظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا —— خالص فلسفہ وعمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل وقال اور ردّ وقدح یا کم از کم ترجیح وانتخاب کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس ومشہود تھے اور اس میدان میں چون وچرا کی گنجائش موجود نہیں تھی، لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادے اور حیاتِ اخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیت پوری امتِ مسلمہ حتیٰ کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اولین کوشش اور ان کا ماحصل

مغربی فلسفہ وفکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اسی دوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین ومذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفظ کی سعی کی۔ تحفظ ومدافعت کی یہ کوشش دو طرح کی تھیں

ایک وہ جن میں محض تحفظ پر قناعت کی گئی اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر وانکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحابِ کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین وایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے اور ہر طرح کے طعن واستہزء کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امت کے ایک حصے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادہ پرستی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ وقال الرسولؐ کی صداؤں میں دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا —— اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی۔

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا —— کہ زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار ونظریات کے صحیح وغلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے، جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں تھے، چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (rationalism) کی کسوٹی پر ہندو مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات اور ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجتاً اسلامی

عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماوراء الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمد عبدہ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقی کی اس راہ پر گامزن ہوسکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ لیکن بہرحال امر واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور 'معذرت' پیش ہوگیا۔

علوم عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات بعد الممات کے عدم اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور روح کے بجائے مادہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا —— اور دوسری طرف حیاتِ اخروی سرے سے خارج از بحث ہوگئی اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ و بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالم واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (feudal

system) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصہ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں، قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور
بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالفاظ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالم اسلام پر پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطرز نظام زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات دی تھیں، ان کی تالیف و ترتیب سے ''اسلامی نظامِ حیات'' کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لئے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسویں کی یہ اسلامی تحریکیں جو انڈونیشیا سے متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصور دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کئے ہوئے ہے —— پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی وجہ سے عالم اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں میں مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیت مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ و انداز اور تہذیب و تمدن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے، بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا

ہےاورمغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔[1] اور اگر چہ تحفظ وحمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون وامداد کے پردے میں معاشی تفوق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں۔ تاہم تقریباً پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کی براہ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب وتمدن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے، خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی ٹھوس، معاشی مسئلے کی بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبیعات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوتِ محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ماوراء الطبیعاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیت مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خودمختاری کے حصول کے لئے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے۔ لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لئے لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصور کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب اور عوامل سے تقویت پا کر احیائے اسلام، قیام حکومت الٰہیہ اور نفاذِ نظام اسلامی کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرکار ہوئیں جن میں قوت و وسعت اور جذبہ وامنگ کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون، اہم تر تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برصغیر پاک وہند کی جماعت اسلامی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[2] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِ عمل ہیں اور ملت

(۱) دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

(۲) واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے متجاوز ہو چکی ہے۔

اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر آیا ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں الاخوان المسلمون کا اندرون ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُولِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں، رہی برصغیر کی تحریک اسلامی تو اس کا جزو اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریک جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔[1]

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصور دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کا۔

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیات اخروی پر حیات دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعیاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ لیکن انہیں کچھ درخور اعتناء اور لائق التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیۃً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیات نیوی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ آفاق وانفس میں تنہا وہی فاعل

(۱) یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شریفانہ سمجھوتہ' کر کے اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے۔

مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ ''كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْعَابِرُ سَبِيْلٍ''[۱] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[۲] اور جو سنت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنتِ عادت اور سنتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے، گویا ایمان کا وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا ''حال'' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (State) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المؤمنین[۳] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفس انسانی کا اس سے ایسا انس کہ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ[۴] کی کیفیت پیدا ہو سکے، ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح و تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ روح کی بالیدگی اور تزکئے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا

(۱) حدیثِ نبویؐ: ''دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر''

(۲) اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے۔

(۳) حدیثِ نبویؐ الصلوۃ معراج المؤمنین ''نماز مومنوں کی معراج ہے''۔

(۴) حدیثِ نبویؐ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔

جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (Self-Control) کی مشق و ریاضت ہے لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں ''حجاب'' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ ''اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ''![۱] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیث قدسی کہ اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ![۲] اول تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر۔[۳] اسی طرح حج کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ اس کے ذریعے خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برداری کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ و مادہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتاً روح اور اس کی حیات باطنی خارج از بحث ہو گی اور مادہ اور حیات دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ و بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیات دنیوی پر مرکوز ہیں لہٰذا آخری تجزیئے میں اسلام ایک ''سیاسی و عمرانی نظام'' —— (Politico-Social System) بن کر رہ گیا ہے۔ اور ''الٰہیات'' کی حیثیت ایک ''پردے'' سے زیادہ نہ رہی۔[۴] چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبت اور اس

(۱) حدیثِ نبویؐ ''روزہ ڈھال کے مانند ہے''۔

(۲) حدیثِ قدسی ''روزہ میرے لئے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا''۔

(۳) واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

(۴) چنانچہ اس دور کے ایک بہت بڑے متکلم اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ ''اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے''۔ ع ''چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربیؐ است''!

کے سامنے تضرع و اِخبات جو ''عبادت'' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی۔[1]

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع مذہبی سے زیادہ ''سیاسی و عمرانی'' اور دینی سے زیادہ ''دنیوی'' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے —— گو درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی　　　کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔

تو ہم فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن　　　غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

(۱) یہ صورت حال بھی خاصی قدامت پسند، اسلامی تحریکوں، کے یہاں ہے...... ورنہ زیادہ 'ترقی پسند' لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیر اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک 'معاشی' پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص ''نظام ربوبیت'' سے، باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو ان کے ضمن میں جہاں سر سید مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوع بحث نہیں اس لئے کہ چاہے اسے ''قرآنی فکر'' ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہے اس کا خالص مادی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشّمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کئے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　　تا ثریا مے رود دیوار کج!!!

احیائے اسلام کی شرط لازم

''تجدیدِ ایمان''

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کر لے۔

ایمان لامحالہ کسی ماوراء الطبیعاتی حقائق پر یقین کا نام ہے اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اَن دیکھی حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد ان باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ گویا ''ایمان بالغیب'' اس راہ کی شرطِ اولین ہے۔ اور اس کے لئے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطۂ نظر اور طرز فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیت ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے

جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس روحِ ربانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] —— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیث نبوی ﷺ کے مطابق مچھر کے پر سے زیادہ محسوس نہ ہو۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک امت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی واقعتاً پیدا نہ ہو جائے ''احیائے اسلام'' کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کے کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا موثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربانی و نورِ ایمانی سے منور' سینے کبر' حسد' بغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص' طمع' لالچ اور حبِ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و تعلیم' تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے ''دلِ روشن' نورِ یقین اور ''نفسِ گرم'' حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں' اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصد وجودِ خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ يَّهْدِيَ بِكَ اللّٰهُ رَجُلاً وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[2] خلق کی ہدایت و رہنمائی تو

(۱) آیہ قرآنی: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (الحجر:۲۹) ترجمہ: جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لئے سجدے میں۔

(۲) حدیث نبویؐ: ''اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے سے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے''۔

زندگی کا واحد لائحہ عمل قرار دے لیں اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا' آرزو یا حوصلہ و امنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر پاک و ہند میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات' مادے سے زیادہ روح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اخروی کی اہمیت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے' ہماری مراد تبلیغی جماعت سے ہے جسے بجا طور پر تحریک دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحاب ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس کے باوجود کہ اس کے طریق کار سے ہم کلیتہً اتفاق نہیں کرتے' ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتاً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالق کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالیٰ سے بجھتی ہے' دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزاء یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتد بہ حصہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعت دین کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں' جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے' ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی

وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (intellectual minority) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطہ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اولین اہمیت حاصل ہے —— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا اور انہیں جہالت و جاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے —— اور انہیں مادیت والحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خودشناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہو گا —— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیش نظر علمی تحریک کے لئے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو

تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو۔ جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (careers) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اولاً انسان کی آج تک کی سوچ و بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبیعات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکر انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ وحی آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقت نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

> پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منور ہو جائیں، آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

پھر یہی ہوں گے جنہیں 'رسوخ فی العلم' حاصل ہوگا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیت الٰہی پر منتج ہوگا۔ جن کی شخصیتیں ”اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ

الْعُلَمَاءُ،(۱) کی مجسم تفسیر اور ع ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن'' کی عملی تصویر ہوں گی' اس لئے کہ قرآن کا ''مغز'' دراصل یہی 'علم حقیقت' ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً ''استخوان'' کی ہے (۲) —— اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیت ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ **تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن**۔ (۳)

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو 'علم حقیقت' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب ہوں جو قرآن حکیم کی آیاتِ بینات کی صورت میں رواں ہیں۔ ان ہی کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لئے ایک نئی ''تہافت''(۴) تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیین پر از سرِ نو ''رد'' کر(۵) سکیں اور فی الجملہ الحاد و مادہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا مثبت کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی' طبیعات' فلکیات' حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے (۶) اور جو اس حقیقتِ کلی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہر اتم ایمان ہے' انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر فٹ کیا جاسکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے ''الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محلِ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا

(۱) آیت قرآنی: ''اللہ کی خشیت اس کے اہل علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے!''
(۲) ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم ...... استخواں پیش سگاں انداختیم (رومیؒ)
(۳) ترجمہ: ''ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن''
(۴) تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ
(۵) الرد علی المنطقیین۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ
(۶) واضح رہے کہ اس ضمن میں ''حقائق'' اور ''نظریات'' کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

ہے (اور جو فی الواقع ''الٰہیات'' سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علامہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ —— ''ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں' زیر نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں......'' اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمت لوگ اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیتے تو ایک بہت وقیع اور قابل قدر کام ہوجاتا لیکن افسوس کہ خود علامہ مرحوم کے حلقہ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانی طبع کے لئے منتخب نہیں کیا۔

> بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابل ذکر حد تک نہیں ہوجاتا یہ امید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جاسکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے۔

''الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلل و مفصل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برصغیر ہندوپاک ہند میں ہوا ہے' خصوصاً جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون نے ''اسلامی نظام حیات'' اور ''عدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام'' کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتداء قرار دیا جاسکتا ہے اور ادھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کردینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیت بھی ختم کردی ہے جو بجائے خود خاصا قابل قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی ''پڑھے کم لکھے زیادہ'' لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک

مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے‘ دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے‘ آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلمہ علمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو بھی کام کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیت سے زیادہ کیفیت پیش نظر رہے۔

اس کام کے لئے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے۔ اور دوسری طرف قرآن و سنت میں گہری ممارست لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دقت نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے [۱] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دور میں جبکہ مادیت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلط ہے اور کچھ تو فی الواقع طلب معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں۔ پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیار زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید

(۱) الحمدللہ کہ ان مقاصد کے لئے ۷۵ء میں ''تنظیم اسلامی'' کا قیام عمل میں آ گیا۔

روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور اگر کچھ مخلص و صاحب عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھا لیں تو ان شاء اللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرمؐ کے اس قول مبارک کو کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَہٗ [۱] اپنا لائحہ عمل بنا کر علم قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لئے زندگی وقف کر دیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے‘ پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام مواقع و مشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لئے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے —— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی۔ ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو گا۔ دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو گی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو گا۔ نتیجتاً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہو گا اور اس کے لئے ضروری ہو گا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا

(۱) حدیثِ نبویؐ: ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں!''

گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبویؐ، فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم دی جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ والٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

پس نوشت

صفحاتِ گزشتہ میں ''قرآن اکیڈمی'' کا جو خاکہ سامنے آیا ہے وہ راقم کے قلم سے جون 1967ء میں نکلا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل اسی نظریے اور خیال کے تحت اولاً 1914ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ''دارالارشاد'' قائم کیا تھا۔ اور پھر 1937ء میں علامہ اقبال مرحوم کی تحریک پر ''دارالسلام'' کی تاسیس ہوئی تھی۔

''دارالارشاد'' کے بارے میں مولانا آزاد نے 12 نومبر 1915ء کے ''البلاغ'' میں جو شذرہ لکھا تھا اور ''دارالسلام'' کے ضمن میں علامہ اقبال نے جو خط شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی کو تحریر کیا تھا۔ ان کے اقتباسات اس صفحہ کی پشت پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے اس حیرت انگیز مماثلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ان تینوں تجویزوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ پیش نظر مقاصد کے لئے کوئی عملی پیش قدمی نہ ''دارالارشاد'' کے ذریعے ہو سکی نہ ''دارالاسلام'' کے۔ ان میں سے مقدم الذکر کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کتنے عرصے قائم رہا اور کب ختم ہوا اور اغلباً اس کے لئے کہیں کوئی اینٹ رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔ البتہ ''دارالاسلام'' کے نام سے ایک ادارہ باقاعدہ قائم ہوا۔ اس کے لئے ایک ٹرسٹ وجود میں آیا اور کچھ عمارات بھی گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے قریب سرنا ریلوے سٹیشن سے متصل منصۂ شہود پر آ گئیں۔ جہاں اگست 1941ء سے اگست 1947ء تک غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کا دفتر قائم رہا اور اس اعتبار سے یقیناً وہ عمارات ایک اعلیٰ مصرف میں آئیں۔ لیکن ان مقاصد کے لئے براہ راست کوئی پیش قدمی وہاں بھی نہ ہو سکی، جن کے لئے وہ ادارہ اصلاً قائم ہوا تھا۔

''دارالارشاد'' کا مقصد

''چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور ''الہلال'' نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سر نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی، جس کے ذریعے فہم و بصیرت قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے رکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقامِ سعی و تعب ہے۔ یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

''دارالارشاد'' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرف علم اور فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ امت کا فرض انجام دے سکے۔

(البلاغ: 12/نومبر 1915ء)

''دارالسلام'' کا مقصد

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رُوح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات اور اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جہاد کر سکیں!''

(بحوالہ ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی'' صفحہ 82)

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**